

تفہیم القرآن

النحل (۲)

تم ہر برسات میں دیکھتے ہو کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور یکا یک مردہ پڑی ہوئی زمین میں اس کی بدولت جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لئے یہ تمہارے لیے موشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے ذریعہ ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔

یعنی یہ منظر ہر سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے کہ زمین بالکل ٹھیل میدان پڑی ہوئی ہے، زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں، نہ گھاس پھوس ہے، نہ پیل بوٹے، نہ پھول تپتی، اور نہ کسی قسم کے حشرات الارض۔ اتنے میں بارش کا موسم آگیا اور ایک دو چھینٹے پڑتے ہی اسی زمین سے زندگی کے چشمے ابھنے شروع ہو گئے۔ زمین کی تہوں میں دبی ہوئی بے شمار جڑیں یکا یک جی اٹھیں اور ہر ایک کے اندر سے وہی نباتات پھر برآمد ہو گئی جو پھلی برسات میں پیدا ہونے کے بعد مچکی تھی۔ بے شمار حشرات الارض جن کا نام و نشان تک گمی کے زلزلے میں باقی نہ رہا تھا، یکا یک پھر اسی شان سے نمودار ہو گئے جیسے پھلی برسات میں دیکھے گئے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی زندگی میں بار بار تم دیکھتے رہتے ہو، اور پھر بھی تمہیں یہی کی زبان سے یہ سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تمام افسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس حیرت کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمہارا مشاہدہ بے عقل حیوانوں کا سامنا ہے۔ تم کائنات کے کرموں کو تو دیکھتے ہو، مگر ان کے پیچھے خالق کی قدرت اور حرکت کے نشانات نہیں دیکھتے۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ نبی کا بیان سن کر تمہارا دل نہ پکار اٹھتا کہ فی الواقع یہ نشانیاں اس کے بیان کی تائید کر رہی ہیں۔

۱۴ گوبر اور خون کے درمیان کا مطلب یہ ہے کہ جانور جو غذا کھاتے ہیں اس سے ایک طرف تو خون قیاس ہے، اور دوسری طرف فضلہ۔ مگر انہی جانوروں کی صنقبانات میں اسی غذا سے ایک تیسری (باقی صفحہ ۲۹۰ پر)

کھجور کے دھتوں اور انگوڑی کی پیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ اور بھی بنا سکتے ہو اور پاک رزق بھی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے۔

تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات بھی کر دی کہ پیمانوں میں اور دھتوں میں اور ٹہنیوں پر ٹہنیوں

(بقیہ ماثیہ ص ۲۸۹) چیز بھی پیدا ہوتی ہے جو خاصیت، رنگ و بو، قاعدے اور مقصد میں ان دونوں سے بالکل مختلف ہے پھر خاص طور پر نوشیوں میں اس چیز کی پیداوار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد انسان کے لیے بھی بہترین غذا کثیر مقدار میں فراہم کرتے رہتے ہیں۔

لہٰذا اس میں ایک ضمنی اشارہ اس مضمون کی طرف بھی ہے کہ پھلوں کے اس عرق میں وہ مادہ بھی موجود ہے جو انسان کے لیے حیات بخش غذا بن سکتا ہے، اور وہ مادہ بھی موجود ہے جو سڑ کر انگورل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی قوت انتخاب پر منحصر ہے کہ وہ اس سرچشمے سے پاک رزق حاصل کرتا ہے یا عقل و خرد زائل کر دینے والی شراب۔ ایک اور ضمنی اشارہ شراب کی حرمت کی طرف بھی ہے کہ وہ پاک رزق نہیں ہے۔

اللہ وحی کے لغوی معنی ہیں خفیہ اور لطیف اشارے کے جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی اور محسوس نہ کر سکے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ افعال و دل میں بات ڈال لینے، اور ابہام و ضمنی تعلیم و تلقین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب و مدرسہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بغا پر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پانا نظر نہیں آتا، اس لیے اس کو قرآن میں وحی، ابہام اور افعال کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں

کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظ وحی، انبیاء کے لیے مخصوص ہو گیا ہے، ابہام کو اولیاء اور بندگان خاص کے لیے خاص کر دیا گیا ہے، اور افعال نسبتاً عام ہے۔ لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا۔ یہاں آسمانوں پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق ان کا سارا نظام چلتا ہے (وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرًا ۚ ثُمَّ السَّعْدَةُ)۔

زمین پر بھی وحی ہوتی ہے جس کا اشارہ پاتے ہی وہ اپنی سرگذشت سنانے لگتی ہے (يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْيَارًا ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَصْحَابُ الْإِزَالِ)۔ ملائکہ پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ کام کرتے ہیں (رَادِ بُرْجِي رَبِّكَ إِلَى الْمَلَكَةِ إِنِّي مَعَكُمْ)۔ افعال، شہد کی مکھی کو اس کا پورا کام (باقی ص ۲۹۱ پر)

ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے چھلوں کا اس چوس اور اپنے رب کی مہوار کی مہوئی راہوں پر چلی

دقیقہ حاشیہ ص ۲۹) وحی (فطری تعلیم) کے ذریعہ سے سکھایا جاتا ہے جیسا کہ آیت زیر بحیث میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی تک ہی محدود نہیں ہے۔ مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دودھ پینا بھی وحی خداوندی ہی سکھایا کرتی ہے۔ پھر ایک انسان کو غور و فکر اور تحقیق و تجسس کے بغیر جو صحیح تدبیر و یا صائب رائے، یا فکر و عمل کی صحیح راہ سمجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے (وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ إِذْ يَبْنِي الْعِصَىٰ) اور اس وحی سے کوئی انسان بھی محروم نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے اکتشافات ہوئے ہیں، جتنی مفید ایجادیں ہوئی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاضلین، مفکرین اور مصنفین نے جو معرکے کے کام کیے ہیں، ان سب میں اس وحی کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آئے دن اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی بیٹھے بیٹھے دل میں ایک بات آئی، یا کوئی تدبیر سوچ گئی، یا خواب میں کچھ دیکھ لیا۔ اور بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو غیب سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔ ان بہت سی اقسام میں سے ایک خاص قسم کی وحی وہ ہے جس سے انبیاء علیہم السلام نوازے جاتے ہیں اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیے جانے والے کو پورا شعور ہوتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے آرہی ہے۔ اسے اس کے من جانب اللہ ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ عقائد اور احکام اور قوانین اور ہدایات پر مشتمل ہوتی ہے، اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعہ سے نوع انسانی کی رہنمائی کرے۔

لے ”رب کی مہوار کی مہوئی راہوں کا اشارہ اس پورے نظام اور طریق کار کی طرف ہے جس پر شہد کی مکھیوں کا ایک گروہ کام کرتا ہے۔ ان کے چھتوں کی ساخت، ان کے گروہ کی تنظیم، ان کے مختلف کارکنوں کی تقسیم کار، ان کی فراہمی غذا کے لیے سیم آمد و رفت، ان کا یا قاعدگی کے ساتھ شہد بنا بنا کر ذخیرہ کرتے جانا، یہ سب وہ راہیں ہیں جو ان کے عمل کے لیے ان کے رب نے اس طرح مہوار کر دی ہیں کہ انہیں کبھی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس ایک مقرر نظام ہے جس پر ایک گے بندھے طریقے پر شکر کے یہ بنے شمار چھوٹے چھوٹے کارخانے ہزار ہا برس سے کام کیے چلے جا رہے ہیں۔

اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شہرت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

لے شہد کا ایک مفید اور لذیذ غذا ہونا تو ظاہر ہے، اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا گیا، البتہ اس کے اندر شفا ہونا نسبتہ ایک مخفی بات ہے اس لیے اس پر تفسیر کر دیا گیا۔ شہد اول تو بعض امراض میں بہانے خود مفید ہے، کیونکہ اس کے اندر چھوٹے اور چھوٹے کلس، اور ان کا گلو کو زاپنی بہترین شکل میں موجود ہوتا ہے۔ پھر شہد کا یہ خاصہ کہ وہ خود بھی نہیں بڑھتا اور دوسری چیزوں کو بھی اپنے اندر ایک مدت تک محفوظ رکھتا ہے، اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ دو ہفتے تیار کرنے میں اس سے مدد لی جائے۔ چنانچہ انکو بل سے پہلے دنیا کے فن و دوا سازی میں وہ صدیوں اسی غرض کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ فرید بریاں شہد کی مکھی اگر کسی ایسے علاقے میں کام کرتی ہے جہاں کوئی خاص جڑی بوٹی کثرت سے پائی جاتی ہو تو اس علاقے کا شہد محض شہد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس جڑی بوٹی کا بہترین جوہر بھی ہوتا ہے اور اس مرض کے لیے مفید ہوتا ہے جس کی دوا اس جڑی بوٹی میں خدانے پیدا کی ہے۔ شہد کی مکھی سے کام اگر باقاعدگی سے لیا جائے، اور مختلف نباتی دواؤں کے جوہر اس سے نکلوا کر ان کے شہد علیحدہ علیحدہ محفوظ کیے جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ یہ شہد بیکار ٹریوں میں نکالے ہوئے جوہروں سے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

۱۔ اس پورے بیان سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے دوسرے جز کی صداقت ثابت کرنا ہے۔ کفار و مشرکین دو ہی باتوں کی وجہ سے آپ کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ آپ آخرت کی زندگی کا تصور پیش کرتے ہیں جو اخلاق کے پورے نظام کا نقشہ بدل داتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ صرف ایک اللہ کو معبود اور مطاع اور مشکل کشا و فریاد رس قرار دیتے ہیں جس سے وہ پورا نظام زندگی غلط قرار پاتا ہے جو شرک یا وہ بت کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہو۔ دعوت محمدی کے انہی دونوں اجزاء کو برحق ثابت کرنے کے لیے یہاں آثار کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بیان کا مدعا یہ ہے کہ اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، یہ آثار جو ہر طرف پائے جاتے ہیں انہی کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں یا تمہارے اوہام و تخیلات کی؟ یہی کہتا ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تم اسے ایک ان ہونی بات قرار دیتے ہو۔ مگر زمین ہر بارش کے موسم میں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اعادہ خلق نہ صرف ممکن ہے بلکہ روز تہاری آنکھوں کے سامنے رہا کرتی ہے۔

اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر وہی تم کو موت دیتا ہے۔ اور تم میں سے کوئی طویل زندگی پا کر بدترین عمر کو پہنچ جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل ہے اور قدرت میں بھی مطلق

دغور کرو، اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں جو فضیلت عطا کر رکھی ہے تو ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جنہیں فضیلت دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں۔ تاکہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ پھر کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۲) پورا ہے۔ نبی کہتا ہے کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے۔ تمہارے دہریے اس بات کو ایک بے ثبوت دعویٰ قرار دیتے ہیں۔ مگر مشیموں کی ساخت، کھجوروں اور انگوروں کی بناوٹ اور شہد کی مکھیوں کی خلقت گواہی دے رہی ہے کہ ایک حکیم اور باری رحیم نے ان چیزوں کو ڈیزائن کیا ہے۔ مرنے کیونکر ممکن تھا کہ اتنے جانور اور اتنے درخت اور اتنی مکھیاں مل جلیں کہ انسان کے لیے ایسی ایسی نفیس اور لذیذ اور مفید چیزیں اس باقاعدگی کے ساتھ پیدا کرتی رہتیں۔ نبی کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی تمہاری پرستش اور حمد و ثنا اور شکر و وفا کا مستحق نہیں ہے۔ تمہارے مشرکین اس پر ناک بھول چڑھتے ہیں اور اپنے بہت سے معبودوں کی نذر و نیاز بجالانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مگر تم خود ہی بتاؤ کہ یہ دودھ اور پھل کھجوریں اور یہ انگور اور یہ شہد، جو تمہاری بہترین غذا ہیں، خدا کے سوا اور کس کی بخشی ہوئی نعمتیں ہیں؟ کس دیوی یا دیوتا یا ولی نے تمہاری رزق رسانی کے لیے یہ انتظامات کیے ہیں؟

یہ یعنی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تمہاری پرورش اور رزق رسانی کا سارا انتظام اللہ کے ہاتھ میں ہے بلکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ تمہاری زندگی اور موت، دونوں اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ کوئی دوسرا زندگی بخشنے کا اختیار رکھتا ہے نہ موت دینے کا۔

یعنی یہ علم جس پر تم نے ہوا جس کی بدولت ہی زمین کی دوسری تمام مخلوقات پر تم کو شرف حاصل ہے یہی خدا کا بخشا ہوا ہے تم اپنی آنکھوں سے جو برتاؤ نظر دیکھتے رہتے ہو کہ جب کسی انسان کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ لمبی عمر دے دیتا ہے تو وہی شخص جو کبھی جوانی میں دوسروں کو عقل سکھاتا تھا، کس طرح گوشت کا ایک لٹخرا بن کر وہ جانے سے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں دہتا۔

کو انکار ہے؟

لے زمانہ حال میں اس آیت سے جو عجیب و غریب معنی نکالے گئے ہیں وہ اس امر کی بدترین مثال ہیں کہ قرآن کی آیات کو ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ایک ایک آیت کے الگ معنی پینے سے کسی کسی اطفال اور بچوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ لوگوں نے اس آیت کو اسلام کے فلسفہ معیشت کی اصل ٹھہرایا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا نشانہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے رزق میں فضیلت عطا کی ہو انہیں اپنا رزق اپنے نوکروں اور غلاموں کی عافیت ضرور دینا چاہیے، اگر نہ تو بائیں گے تو اللہ کی نعمت کے منکر قرار پائیں گے۔ حالانکہ اس پر سے سلسلہ کلام میں فلسفہ معیشت کے بیان کا سرسے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ اوپر سے تمام فقر پر مشرک کے ابطال اور توحید کے اثبات میں ہوتی چلی آ رہی ہے اور آگے بھی مسلسل ہی مضمون چل رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ میں یکایک فلسفہ معیشت کی ایک دفعہ بیان کر دینے کا آخر کو نساٹک ہے؟ آیت کو اس کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بالکل برعکس مضمون بیان ہو رہا ہے۔ یہاں استدلال یہ کیا گیا ہے کہ تم خود اپنے مال میں اپنے غلاموں اور نوکروں کو جب برابر کا درجہ نہیں دیتے۔ رہا کہ یہ مال خدا کا دیا ہوا ہے۔ تو آخر کس طرح یہ بات تمہاری عقل میں سکتی ہے کہ خدا جو بذاتِ خود ہر چیز کا مالک ہے، اس نے اپنی مخلوقات میں سے بعض کو اپنی خدائی میں حصہ دار بنا لیا ہوگا؟

ٹھیک یہی استدلال، اسی مضمون سے سورہ روم زرکورہ ۴ کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ وہاں اس کے الفاظ یہ ہیں: **عَرَبٌ لِّكُمْ مَثَلًا مِّنَ الْفِئَسِ كَهَلِّ لِكُم مِّن مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّن شُرَكَاءِ فِي مَا سَدَقْتُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ تَخَافُوهُمْ كَخِيفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ، كَذٰلِكَ اَنْفَعِلُ الْاٰلِيَّتِ لِعٰمٍ يَّعْلَمِ** اللہ تمہارے سامنے ایک مثال خود تمہاری اپنی ذات سے پیش کرتا ہے۔ کیا تمہارے اس رزق میں جو ہم نے تمہیں رکھے تمہارے غلام تمہارے شریک ہیں حتیٰ کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں؟ اور تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنے برابر والوں سے ڈرتے ہو؟ اس طرح اللہ کیل کھول کر نشانیاں پیش کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ دونوں آیتوں کا تقابل کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی مثال سے استدلال کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسری کی تفسیر کر رہی رہا ہے۔

اللہ ہی نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں پیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں۔ پھر کیا یہ لوگ دیہ سب کچھ دیکھتے اور جلتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو

(تعبیر ماشیہ ص ۲۹۴) شاید لوگوں کو غلط نہیں آتی جَعَدَ اللّٰہُ یَحْجُدُ وَاِنَّہُمْ لَیَکٰفِرُوْنَ کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ انہوں نے تمہیل کے بعد متصلاً یہ فقرہ دیکھ کر خیال کیا کہ چونکہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اپنے زیر دستوں کی طرف رزق پھیر دینا اللہ کی نعمت کا انکار ہے۔ حالانکہ جو شخص قرآن میں کچھ بھی نظر رکھتا ہے وہ اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر یہ غیر اللہ کو ادا کرنا اس کتاب کی نگاہ میں اللہ کی نعمتوں کا انکار ہے۔ یہ مصنون اس کثرت سے قرآن میں دہرایا گیا ہے کہ تلاموت و تدبیر کی عادت رکھنے والوں کو تو اس میں اشتباہ پیش نہیں آسکتا، البتہ ان لوگوں کی مدد سے اپنے مطلب کی آیات نکال کر مضامین تیار کرنے والے حضرات اس سے ناواقف ہو سکتے ہیں۔

نعمت الہی کے انکار کا یہ مفہوم سمجھ لینے کے بعد اس فقرے کا یہ مطلب صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ جب یہ لوگ مالک اور مملوک کا فرق خوب جانتے ہیں، اور خود اپنی زندگی میں ہر وقت اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں، تو کیا پھر ایک اللہ ہی کے معاملہ میں انہیں اس بات پر اصرار ہے کہ اُس کے بندوں کو اس کا شریک و ہم پیمان بنائیں اور جو نعمتیں انہوں نے اُس سے پائی ہیں ان کا شکر یہ اُس کے بندوں کو ادا کریں۔

لہٰذا باطل کو مانتے ہیں، یعنی یہ بے بنیاد اور بے حقیقت عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کی قسمتیں بنانا اور لکھنا ان کی مرادیں بر لانا اور دعائیں سننا، انہیں اولاد دینا، ان کو روزگار دلوانا، ان کے مقدر سے جتنا ادا نہیں بیاریوں سے بچانا کچھ دیوبندوں اور دیوتاؤں اور جنوں اور ولیوں کے اختیار میں ہے۔

لہٰذا اگرچہ مشرکین مکہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ ہی کی دی ہوئی ہیں، اور ان نعمتوں پر اللہ کا احسان مانتے سے بھی انہیں انکار نہ تھا، لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر یہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان بہت سی بہتیبوں کا شکر یہ بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی شد کے اس نعمت بخشی میں ذلیل اور حردار (باقی ص ۲۹۶ پر)

پوچتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انہیں رزق دینا ہے نہ زمین سے اور نہ یہ کام وہ کر ہی سکتے ہیں؟ پس اللہ کے لیے مثالیں نہ گھرو، اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

(فقیر حاشیہ ص ۳۸۵) ٹھیکر لکھا تھا۔ اسی چیز کو قرآن اللہ کے احسان کا انکار قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدہ کلیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکر یہ غیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ غلام شخص کے طفیل، یا غلام کی رعایت سے، یا غلام کی سفارش سے، یا غلام کی مدد و نصرت سے کیا ہے، یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔ یہ دونوں اہم ملی باتیں سر اسرار انصاف اور عقل عام کے مطابق ہیں۔ ہر شخص خود با دینی تا مل ان کی مقبولیت سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ ایک حاجت مند آدمی پر رحم کھا کر اس کی مدد کرتے ہیں اور وہ اسی وقت اٹھ کر آپ کے سامنے ایک دوسرے آدمی کا شکر یہ ادا کر دیتا ہے جس کا اس ادا میں کوئی دخل نہ تھا۔ آپ چاہے اپنی فراخ دلی کی بنا پر اس کی مدد ہی کی ہو تو نظر انداز کر دیں اور آئندہ بھی اپنی امداد کا سلسلہ جاری رکھیں، مگر اپنے دل میں یہ ضرور سمجھیں گے کہ یہ ایک نہایت بدتمیز اور احسان فراموش آدمی ہے پھر اگر دریافت کرنے پر آپ کو معلوم ہو کہ اس شخص نے یہ حرکت اس خیال کی بنا پر کی تھی کہ آپ نے اس کی جو کچھ بھی مدد کی ہے وہ اپنی نیک ولی اور فیاضی کی وجہ سے نہیں کی بلکہ اس دوسرے شخص کی خاطر کی ہے، درانحالیکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو آپ لا محالہ اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ اس کی اس بہودہ تاویل کا صریح مطلب آپ کے نزدیک یہ ہو گا کہ وہ آپ سے سخت بدگمان ہے اور آپ کے متعلق یہ رٹے رکھتا ہے کہ آپ کوئی رحیم اور شفیق انسان نہیں ہیں، بلکہ محض ایک دوست نواز اور یار باش آدمی ہیں، چند گئے بندھے دوستوں کے ترسل سے کوئی آئے تو آپ اس کی مدد ان دوستوں کی خاطر کرتے ہیں، ورنہ آپ کے ہاتھ سے کسی کو کچھ فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔

۱۰۰ اللہ کے لیے مثالیں گھرو یعنی اللہ کو ذیوی بادشاہوں اور سلجوں اور جباروں کی تیسرا شکر کہ وہ کہ جس کوئی ان کے مصاحبوں اور مرتب باگاہ ملازموں کے توسط سے بغیر ان تک اپنی عرض و معنی نہیں پہنچا سکتا اسی طرح اللہ کے متعلق بھی تم یہ گمان کرنے لگو کہ وہ اپنے قصر شامی میں ملکہ اور اولیاء و روضے سے تمہارے درمیان گھرا بیٹھا ہے کسی کا کوئی کام ان کے واسطے بغیر اس کے ہاں سے نہیں ہو سکتا۔

اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک تو ہے غلام، جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ایسا ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا کیا ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور چھپے خوب خرچ کرتا ہے۔ بتاؤ، کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ — الحمد للہ، مگر اکثر لوگ اس سیدھی بات کو نہیں جانتے۔

۱۷ یعنی اگر مثالوں ہی سے بات سمجھنی ہے تو اللہ صبح مثالوں سے تم کو حقیقت سمجھاتا ہے تم جو مثالیں دے رہے ہو وہ غلط ہیں، اس لیے تم ان سے غلط نتیجے نکال بیٹھتے ہو۔

۱۸ سوال اور الحمد للہ کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے بھرنے کے لیے خود لفظ الحمد للہ ہی میں مدینہ اشارہ موجود ہے ظاہر ہے کہ نبی کی زبان سے یہ سوال سن کر مشرکین کے لیے اس کا یہ جواب دینا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ دونوں برابر ہیں۔ لامحالہ اس کے جواب میں کسی نے صاف صاف اقرار کیا ہو گا کہ واقعی دونوں برابر نہیں ہیں، اور کسی نے اس انیشے سے خاموشی اختیار کر لی ہوگی کہ اقراری جواب دینے کی صورت میں اس کے منطقی نتیجے کا بھی اقرار کرنا ہو گا اور اس سے خود بخود ان کے شرک کا ابطال ہو جائیگا۔ لہذا نبی نے دونوں کا جواب پا کر فرمایا الحمد للہ۔ اقرار کرنے والوں کے اقرار پر بھی الحمد للہ، اور خاموش رہ جانے والوں کی خاموشی پر بھی الحمد للہ یہی صورت میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ "خدا کا شکر ہے، اتنی بات تو تمہاری سمجھ میں آئی۔" دوسری صورت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ خاموش ہو گئے؟ الحمد للہ، اپنی ساری بیٹ و حسریوں کے باوجود دونوں کو برابر کہہ دینے کی ہمت تم بھی نہ کر سکتے۔

۱۹ یعنی باوجودیکہ انسانوں کے درمیان وہ صریح طور پر بااختیار اور بے اختیار کے فرق کو محسوس کرتے ہیں، اور اس فرق کو ملحوظ رکھ کر ہی دونوں کے ساتھ الگ الگ طرز عمل اختیار کرتے ہیں، پھر بھی وہ ایسے جاہل و نادان بنے ہوئے ہیں کہ خالق اور مخلوق کا فرق ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ خالق کی ذات اور صفات اور حقوق اور اختیارات سب میں وہ مخلوق کو اس کا شریک سمجھ رہے ہیں اور مخلوق کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کر رہے ہیں جو صرف خالق کے ساتھ ہی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ عالم اسباب میں کوئی چیز مانگتی ہو تو گھر کے مالک سے مانگیں گے۔ نہ کہ گھر کے غلام سے۔ مگر یہ افیض سے حاجات طلب کرتی ہوں تو کائنات کے مالک کو چھوڑ کر اس کے بندوں کے آپگے ہاتھ پھیلا دیں گے۔

اللہ ایک اور مثال دیتا ہے۔ دو آدمی ہیں۔ ایک گونگا بہرا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا، اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے، حد صحر ہی وہ اسے بھیجے کوئی جہلا کام اس سے بن نہ آئے۔ دوسرا شخص ایسا ہے کہ انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود راہ راست پر قائم ہے۔ بتاؤ کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟ زمین اور آسمانوں کی تمام پرتیہ حقیقتوں کا علم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ اور قیامت کا معاملہ بس پلک جھپکاتے میں واقع ہو جائے گا، بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہی ہیں۔ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

لد پہلی مثال میں اللہ اور بناوٹی معبودوں کے فرق کو صرف اختیار اور بے اختیاری کے اعتبار سے نمایاں کیا گیا تھا۔ اب اس دوسری مثال میں وہی فرق اور زیادہ طول کر صفات کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور ان بناوٹی معبودوں کے درمیان فرق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک یا اختیار مالک ہے اور دوسرا بے اختیار غلام۔ بلکہ فرید برآں یہ فرق بھی ہے کہ یہ غلام نہ تہااری پکار سکتا ہے، نہ اس کا جواب دے سکتا ہے، نہ کوئی کام یا اختیار خود کر سکتا ہے۔ اس کی اپنی زندگی کا سارا انحصار اس کے آقا کی نواہ پر ہے۔ اور آقا اگر کوئی کام اس پر چھوڑے تو وہ کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ بخلاف اس کے آقا کا حال یہ ہے کہ صرف ناطق ہی نہیں ناطق حکیم ہے، دیتا کو عدل کا حکم دیتا ہے۔ اور صرف فاعل مختار ہی نہیں، فاعل برحق ہے، جو کچھ کرتا ہے راستی اور صحت کے ساتھ کرتا ہے۔ بتاؤ یہ کونسی دانائی ہے کہ تم ایسے آقا اور ایسے غلام کو یکساں سمجھ رہے ہو؟

تھ بعد کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل جواب ہے کفار مکہ کے اس سوال کا جو وہ اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے کہ اگر واقعی وہ قیامت آنے والی ہے جس کی تم ہمیں خبر دیتے ہو تو آخر وہ کس تاریخ کو آئیگی۔ یہاں ان کے سوال کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

تھ یعنی قیامت رفتہ رفتہ کسی طویل مدت میں واقع نہ ہوگی، نہ اس کی آمد سے پہلے تم دوسرے اس کو آتے دیکھو گے کہ سنبھل سکو اور کچھ اس کے لیے تیاری کر سکو۔ وہ تو کسی روز آچانک پلک جھپکاتے میں، بلکہ اس سے بھی کم مدت میں آجائے گی۔ لہذا جس کو غور کرنا ہو سنجیدگی کے ساتھ غور کرے، اور اپنے رویہ کے متعلق جو فیصلہ بھی کرتا ہر جلدی کرے، کسی کو اس بھر سے پر نہ رہنا چاہیے کہ ابھی تو قیامت رہتی رہتی ہے۔

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اُس نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں، اور سوچنے والے دل دیئے، اس لیے کہ تم شکر گزار بنو۔

کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں؟ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے؟ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا۔ اس نے جانوروں کی کھالوں سے

تمہارے لیے ایسے مکان پیدا کیے جنہیں تم سفر اور قیام، دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو۔ اس

(تفسیر حاشیہ ص ۲۹۵) دُور ہے جب اُنے لیلیٰ تو اللہ سے معاملہ درست کر میں گے۔ توحید کی تقریر کے درمیان بیکام قیامت کا یہ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ لوگ توحید اور شکر کے درمیان کسی ایک عقیدے کے انتخاب کے سوال کو محض ایک نظری سوال نہ سمجھ بیٹھیں، بلکہ انہیں یہ احساس ہے کہ ایک جھیلہ کی گھڑی کسی نامعلوم وقت پر چاکلک آجانے والی ہے اور اس وقت اسی انتخاب کے صحیح یا غلط ہونے پر آدمی کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہوگا۔ اس تشبیہ کے بعد پھر وہی سلسلہ تقریر شروع ہو جاتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا تھا۔

یعنی وہ ذرائع جن سے تمہیں دنیا میں ہر طرح کی واقفیت حاصل ہوئی اور تم اس لائق ہوئے کہ دنیا کے کام چلا سکو۔ انسان کا بچہ پیدائش کے وقت جتنا بے بس اور بے خبر ہوتا ہے اتنا کسی جانور کا بچہ نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف اللہ کے دیے ہوئے ذرائع علم (سماعت، بینائی، اور تعقل و تفکر) ہی ہیں جن کی بدولت وہ ترقی کر کے تمام موجودات ارضی پر حکمرانی کرنے کے لائق بن جاتا ہے۔

یعنی اُس خدا کے شکر گزار جس نے یہ سب بہانعمتیں تم کو عطا کیں۔ ان نعمتوں کی اس سے بڑھ کر ناشکری اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کانوں سے آدمی سب کچھ سنے مگر ایک خدا ہی کی بات نہ سنے، ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھے مگر ایک خدا ہی کی آیات نہ دیکھے، اور اس مانع سے سب کچھ سوچے مگر ایک یہی بات نہ سمجھے کہ میرا وہ محسن کون ہے جس نے یہ انعامات مجھے دیئے ہیں۔

یعنی چمڑے کے نیچے جن کا دلج عرب میں بہت ہے۔

یعنی جب کوچ کرنا چاہتے ہو تو انہیں آسانی سے ترک کر کے اٹھالے جاتے ہو اور جب قیام کرنا چاہتے ہو تو آسانی

نے جانوروں کے صرف اور امان اور بالوں سے تمہارے لیے پہننے اور بہتے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دیں جو زندگی کی مدت مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں۔ اس نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے تمہارے لیے سائے کا انتظام کیا، پہاڑوں میں تمہارے لیے پناہ گاہیں بنائیں، اور تمہیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ دوسری پوشاکیں جو آپس کی جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔ اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے شاید کہ تم فرمانبردار بنو۔ اب اگر یہ لوگ

لہ سرودی سے بچانے کا ذکر یا تو اس لیے نہیں فرمایا کہ گرمی میں کپڑوں کا استعمال انسانی تمدن کا تکمیلی درجہ ہے اور درجہ کمال کا ذکر کر لینے کے بعد ابتدائی درجات کے ذکر کی حاجت نہیں رہتی، یا پھر اسے خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جن ملکوں میں نہایت جھلک قسم کی بادِ سموم چلتی ہے وہاں سرودی کے لباس سے بھی بڑھ کر گرمی کا لباس اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے ممالک میں اگر آدمی سر، گردن، کان اور سارا جسم اچھی طرح ڈھانک کر نہ نکلے تو گرم ہوا اسے مجلس کر رکھ دے۔ بلکہ بعض اوقات تو استکھوں کو چھوڑ کر پورا منہ تک پیٹ لینا پڑتا ہے۔

۱۷ یعنی زرہ بختہ۔

۱۸ اتمامِ نعمت یا تکمیلِ نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر پہلو میں انسان کی ضروریات کا پوری جزبہ کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور پھر ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام فرماتا ہے۔ مثلاً اسی معاملے کو دیکھ کر خارجی اثرات سے انسان کے جسم کی حفاظت مطلوب تھی۔ اس کے لیے اللہ نے کس کس پہلو سے کتنا کتنا اور کیسا کچھ سر و سامان کیا، اس کی تفصیلات اگر کوئی دیکھنے بیٹھے تو ایک پوری کتاب تیار ہو جائے۔ یہ گویا لباس اور مکان کے پہلو میں اللہ کی نعمت کا اتمام ہے۔ یا مثلاً تغذیہ کے معاملہ کو دیکھو۔ اس کے لیے کتنے بڑے پیمانے پر، کیسے کیسے ترشحات کے ساتھ کیسی کیسی جزئی ضرورتوں تک کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ نے بے حد حسا ذرائع فراہم کیے، ان کا اگر کوئی جائزہ لینے بیٹھے تو شاید محض اقسامِ غذا اور ذیابہ غذا کی فہرست ہی ایک ضخیم جلد بن جائے۔ گویا تغذیہ کے پہلو میں اللہ کی نعمت کا اتمام ہے۔ اسی طریقہ سے اگر انسانی زندگی کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لیا دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر گوشے میں اللہ نے ہم پر اپنی نعمتوں کا اتمام کر رکھا ہے۔

منہ مڑتے ہیں تو اسے محمد تم پر صاف صاف پیغام حق پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اللہ کے احسان کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں بیش تر لوگ ایسے ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

انہیں کچھ ہوش بھی ہے کہ اُس روز کیا ہوگی، جبکہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، پھر کافروں کو نہ جنتیں پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا نہ ان سے توبہ و استغفار ہی کا مطالبہ کیا جائیگا۔

لہٰذا انکار سے مراد وہی طرز عمل ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کفار مکہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ یہ سب احسانات اللہ نے اُن پر کیے ہیں، مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ نے یہ احسانات اُن کے بزرگوں اور دیوتاؤں کی مدد سے کیے ہیں، اور اسی بنا پر وہ ان احسانات کا شکر اللہ کے ساتھ، بلکہ کچھ اللہ سے بھی بڑھ کر ان متوسط ہستیوں کو ادا کرتے تھے۔ اسی حرکت کو اللہ تعالیٰ انکا نعمت اور احسان فراموشی اور کفران سے تعبیر کرتا ہے۔

یعنی اُس امت کا نبی، یا کوئی ایسا شخص جس نے نبی کے گزر جانے کے بعد اس امت کو توحید اور خالص خدا پرستی کی دعوت دی ہو، شرمک اور شرمکانہ اوہام و رسوم پر متنبہ کیا ہو، اور روز قیامت کی جوابدہی سے خبردار کر دیا ہو۔ وہ اس امر کی شہادت دے گا کہ میں نے پیغام حق ان لوگوں کو پہنچا دیا تھا، اس لیے جو کچھ انہوں نے کیا وہ ناواقفیت کی بنا پر نہیں کیا بلکہ جلتے بوجھتے کیا۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں صفائی پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائیگی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے جرائم ایسی سچ ناقابل انکار اور قابل تاویل شہادتوں سے ثابت کر دیے جائیں گے کہ ان کے لیے صفائی پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی۔

یعنی اُس وقت اُن سے یہ نہیں کہا جائیگا کہ اب اپنے رب سے اپنے قصوروں کی معافی مانگ لو۔ کیونکہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا۔ معافی طلب کرنے کا وقت گزر چکا ہوگا۔ قرآن اور حدیث دونوں اس معاملہ میں ناطق ہیں کہ توبہ و استغفار کی جگہ دنیا ہے نہ کہ آخرت۔ اور دنیا میں بھی اس کا موقع صرف اسی وقت تک ہے جب تک آثار موت طاری نہیں ہو جاتے۔ جس وقت آدمی کو یقین ہو جائے کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے اُس وقت کی توبہ ناقابل قبول ہے۔ موت کی سرحد میں داخل ہوتے ہی آدمی کی مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے اور صرف جزا و سزا ہی کا استحقاق باقی رہ جاتا ہے۔

ظالم لوگ جب ایک ذبح عذاب دیکھیں گے تو اس کے بعد نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انہیں ایک لمحہ بھری جہالت دی جائے گی۔ اور جب وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں شرک کیا تھا اپنے ٹھیرائے ہوئے شرکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے "اے پروردگار! یہی ہیں ہم سے وہ شرک جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے" اس پر ان کے وہ معبود انہیں صاف جواب دیں گے کہ تم جھوٹے ہو، اس وقت یہ سب اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری اقرا پر دازیاں رنڈ پکڑ ہو جائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔ جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے اس خدا کے بدلے جو دنیا میں برپا کرتے رہے۔

(اے محمد! انہیں اس دن سے خبردار کر دو) جب کہ ہم ہر امت میں خود اسی کے اندر سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں گے جو اس کے مقابلہ میں شہادت دے گا، اور ان لوگوں کے مقابلے میں

لہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بجائے خود اس واقعہ کا انکار کریں گے کہ مشرکین انہیں حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے پکارا کرتے تھے، بلکہ دراصل وہ اس واقعہ کے متعلق اپنے علم و اطلاع اور اس پر اپنی رضامندی و ذمہ داری کا انکار کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہمیں پکارا کرو، نہ ہم تمہاری اس حرکت پر راضی تھے، بلکہ ہمیں تو خیر تک نہ تھی کہ تم ہمیں پکار رہے ہو۔ تم نے اگر ہمیں سمیع الدعاء، اور مجیب الدعوات، اور دستگیر و فرایدرس قرار دیا تھا تو یہ قطعی ایک جھوٹی بات تھی جو تم نے گھڑی تھی اور اس کے ذمہ دار تم خود تھے، اب ہمیں اس کی ذمہ داری میں بیٹھنے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔

لہ یعنی وہ سب غلط ثابت ہوگی جن سہاروں پر یہ دنیا میں بھروسہ کیا کرتے تھے وہ سارے سارے گم ہو جائیں گے کسی فرایدرس کو وہاں فرایدرسی کیسے موجود نہ پائیں گے۔ کوئی مشکل کشان کی مشکل حل کرنے کے لیے نہیں بیگا۔ کوئی آگے بڑھ کر یہ کہنے والا نہ ہوگا کہ یہ میرے متوسل تھے، انہیں کچھ نہ کہا جائے۔

یعنی ایک عذاب خود کفر کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو راہ خدا سے روکنے کا۔

شہادت دینے کے لیے ہم نہیں لائیں گے۔ اور یہ اسی شہادت کی تیاری ہے کہ ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کر دی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت اور نجات ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے سہر تسلیم ختم کر دیا ہے۔

اللہ انصاف اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے

بچنے یعنی ہر ایسی چیز کی وضاحت جس پر ہدایت و ضلالت اور فلاح و خسار کا مدار ہے، جس کا جاننا راست روی کے لیے ضروری ہے، جس سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔

یعنی جو لوگ آج اس کتاب کو مان لیں گے اور اطاعت کی راہ اختیار کر لیں گے ان کو یہ زندگی کے ہر معاملہ میں صحیح رہنمائی دیگی اور اس کی پیروی کی وجہ سے ان پر اللہ کی رحمتیں ہونگی اور انہیں یہ کتاب اطمینان و لامے گی کہ فیصلے کے دن اللہ کی عدالت سے وہ کامیاب ہو کر نکلیں گے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اسے نہ مانیں گے وہ صرف یہی نہیں کہ ہدایت اور رحمت سے محروم رہیں گے، بلکہ قیامت کے روز جب خدا کا پیغمبر ان کے مقابلہ میں گواہی دینے کھڑا ہوگا تو یہی دستاویز ان کے خلاف ایک زبردست حجت ہوگی۔ کیونکہ پیغمبر یہ ثابت کر دیگا کہ اس نے وہ چیز انہیں پہنچادی تھی جس میں حق اور باطل کا فرق کھل کر رکھ دیا گیا تھا۔

یعنی نیک برتاؤ اور نیک سلوک، ہر اس شخص کے ساتھ جس سے آدمی کو سابقہ پیش آئے۔

یعنی صلہ رحمی کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار رہے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعت الہی ہر خاندان کے خوشحال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا نہ لگانا چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو (باقی صفحہ ۳۰۴ پر)

منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم مبتلیٰ نہ ہو۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اُس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سُوت کاٹا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے

دقیقہ ماشیہ ص ۳۳) معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور ہر خاندان کے خوشحال افراد پر پہلا حق ان کے اپنے غریب رشتہ داروں کا ہے، پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین خمدار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے، اور اس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں۔ اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں۔ اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچا زاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے فائدہ دار ہوں، اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔

۱۰۔ یہاں علیٰ الترتیب تین قسم کے معاہدوں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے الگ الگ بیان کیے ان کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک وہ عہد جو انسان نے خدا کے ساتھ باندھا ہو، اور دوسری اہمیت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ دوسرا وہ عہد جو ایک انسان یا گروہ نے دوسرے انسان یا گروہ سے باندھا ہو اور اس پر اللہ کی قسم کھائی ہو، یا کسی نہ کسی طور پر اللہ کا نام لیکر اپنے قول کی پختگی کا یقین دلایا ہو۔ یہ دوسرے درجے کی اہمیت رکھتا ہے۔ تیسرا وہ عہد و پیمانہ جو اللہ کا نام لیے بغیر کیا گیا ہو۔ اس کی اہمیت اوپر کی دونوں قسموں کے بعد ہے۔ لیکن پابندی ان سب کی ضروری ہے اور خلاف و نزی ان میں سے کسی کی بھی روا نہیں ہے۔

معاملات میں مکرو فریب کا ہتھیار بناتے ہوتا کہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرنے
 حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے، اور ضرور وہ قیامت کے
 روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دیگا۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی کہ تم میں

ایسا یہاں خصوصیت کے ساتھ عہد شکنی کی اس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر
 موجب فساد ہوتی ہے اور جسے بڑے بڑے اور نیچے درجے کے لوگ بھی کاربند ہوا ہے سمجھ کر کرتے اور اپنی قوم سے
 واد پلتے ہیں۔ قوموں اور گروہوں کی سیاسی، معاشی اور مذہبی کشمکش میں یہ آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ ایک
 قوم کا لیڈر ایک وقت میں دوسری قوم سے ایک معاہدہ کرتا ہے اور دوسرے وقت میں محض اپنے قومی
 مفاد کی خاطر یا تو اسے علاقہ توڑ دیتا ہے یا دیر پر وہ اس کی خلاف بازی کے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ حرکتیں
 ایسے ایسے لوگ تک کر کرتے ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں بڑے راستیاز ہوتے ہیں۔ اور ان حرکتوں پر
 صرف یہی نہیں کہ ان کی پوری قوم میں سے ملامت کی کوئی آواز نہیں اٹھتی، بلکہ ہر طرف سے ان کی پٹھانگی
 جاتی ہے اور اس طرح کی چالیازویں کو ڈیپو بیسی کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر متنبہ فرماتا ہے
 کہ ہر معاہدہ دراصل معاہدہ کرنے والے شخص اور قوم کے اخلاق و دیانت کی آزمائش ہے اور جو لوگ
 اس آزمائش میں ناکام ہونگے وہ اللہ کی عدالت میں مواخذہ سے نہ بچ سکیں گے۔

یعنی یہ فیصلہ تو قیامت ہی کے روز ہوگا کہ جن اختلافات کی بنا پر تمہارے درمیان کشمکش پیدا
 ہے ان میں برسرِ حق کون ہے اور برسرِ باطل کون۔ لیکن بہر حال، خواہ کوئی سرا سر حق پر ہی کیوں نہ ہو
 اور اس کا حریف بالکل گمراہ اور باطل پرست ہی کیوں نہ ہو، اُس کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہو
 سکتا کہ وہ اپنے گمراہ حریف کے مقابلہ میں عہد شکنی اور کذب و افترا اور مکرو فریب کے ہتھیار استعمال
 کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے روز اللہ کے امتحان میں ناکام ثابت ہوگا، کیونکہ حق پرستی
 صرف نظریے اور مقصد ہی میں صداقت کا مطالعہ نہیں کرتی، طریق کار اور ذرائع میں بھی صداقت ہی
 چاہتی ہے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ ان مذہبی گروہوں کی تنبیہ کے لیے فرمائی جا رہی ہے جو ہمیشہ
 اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ ہم چونکہ خدا کے طرفدار ہیں اور ہمارا فریق مقابل خدا کا (باقی صفحہ ۳۱ پر)

کوئی اختلاف نہ ہو، تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے، اور ضرورتاً تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی۔

اور اے مسلمانو! تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بنا لینا

(فقیر حاشیہ ص ۳۵) باغی ہے اس لیے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اسے جس طریقہ سے بھی ممکن ہو ترک پہنچائیں، ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی صداقت، امانت اور وفائے عہد کا لحاظ رکھیں۔ ٹھیک یہی بات تھی جو عرب کے یہودی کہا کرتے تھے کہ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأَقْتَابِ مَسِيئٌ یعنی مشرکین عرب کے معاملہ میں ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے، اُن سے ہر طرح کی خیانت کی جا سکتی ہے، جس چال اور تدبیر سے بھی خدا کے پیاروں کا بھلا ہو اور کافروں کو ترک پہنچے وہ بالکل روا ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

۱۰ یہ پچھلے مضمون کی فریاد تو صیح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کا طرفدار سمجھ کر پھلے اور برسے ہر طریقہ سے اپنے مذہب کو (جسے وہ خدائی مذہب سمجھ رہا ہے) فروغ دینے اور دوسرے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کی یہ حرکت سراسر اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر اللہ کا منشا واقعی یہ ہوتا کہ انسان سے مذہبی اختلاف کا اختیار چھین لیا جائے اور چاروں مذاہب سارے انسانوں کو ایک ہی مذہب کا پیرو بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لیے اللہ کو اپنے ان نام نہاد ”طرف داروں“ کی اور ان کے ذیل متجھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا۔ وہ سب کو مومن و فرمانبردار پیدا کر دیتا اور کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان و طاعت کی راہ سے بال برابر بھی جنبش کر سکتا۔

۱۱ یعنی انسان کو اختیار و انتخاب کی آزادی اللہ نے خود ہی دی ہے، اس لیے انسانوں کی راہیں دنیا میں مختلف ہیں۔ کوئی گمراہی کی طرف جانا چاہتا ہے اور اللہ اس کے لیے گمراہی کے اسباب ہموار کر دیتا ہے، اور کوئی راہِ راست کا طالب ہوتا ہے اور اللہ اس کی ہدایت کا انتظام فرما دیتا ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم بھٹنے کے بعد اکھڑ جائے اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، برا نتیجہ دیکھو اور سخت سزا بھگتو۔ اللہ کے عہد کو تھوڑے سے فائدے کے بدلے بزیج ڈالو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے، اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔ جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ر آخرت میں، ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے

لے یعنی کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے بعد محض تمہاری بد اخلاقی دیکھ کر اس دین سے برگشتہ ہو جائے اور صرف اس وجہ سے وہ اہل ایمان کے گروہ میں شامل ہونے سے رک جائے کہ اس گروہ کے جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آیا ہو ان کو اخلاق اور معاملات میں اس نے کفار سے کچھ بھی مختلف پایا ہو۔ لے یعنی اس عہد کو جو تم نے اللہ کے نام پر کیا ہو، یا دین الہی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کیا ہو۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے بڑے فائدے کے بدلے بیچ سکتے ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا جو فائدہ بھی ہے وہ اللہ کے عہد کی قیمت میں تھوڑا ہے۔ اس لیے اس بیش بہا چیز کو اس کے عوض بیچنا بہر حال خسارے کا سودا ہے۔

لے "صبر سے کام لینے والوں کو" یعنی ان لوگوں کو جو ہر طمع اور خواہش اور جذبہ نفسانی کے مقابلہ میں حق اور راستی پر قائم رہیں، ہر اس نقصان کو برداشت کر لیں جو اس دنیا میں راستبازی اختیار کرنے سے پہنچتا ہو، ہر اس فائدے کو ٹھکرا دیں جو دنیا میں ناجائز طریقے اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتا ہو، اور حسن عمل کے مفید نتائج کے لیے اس وقت تک انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں جو موجودہ دنیوی زندگی ختم ہو جانے کے بعد دوسری دنیا میں آنے والا ہے۔

لے اس آیت میں مسلم اور کافر دونوں ہی گروہوں کے ان تمام کم نظر اور بے صبر لوگوں کی غلط فہمی دُور کی گئی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی اور دیانت اور پرہیزگاری کی روش اختیار رہا تو (باقی صفحہ پر)

مطابق بخشیں گے۔

پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ رحیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔ اُسے اُن

(تفسیر حاشیہ ص ۳۷) کہ اُسے آدمی کی آخرت چاہیے بن جاتی ہو مگر اس کی دنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے، اس صبح روئیہ سے محض آخرت ہی نہیں بنتی، دنیا بھی بنتی ہے جو لوگ حقیقت میں ایمان دار اور پاکیزہ اور معاملہ کے کھرے ہوتے ہیں اُن کی دنیوی زندگی بھی بے ایمان اور بد عمل لوگوں کے مقابلہ میں صریحاً بہتر رہتی ہے۔ جو ساکھ اور سچی عزت اپنی بے دماغ سیرت کی وجہ سے انہیں نصیب ہوتی ہے وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی جو ستھری اور پاکیزہ کامیابیاں انہیں حاصل ہوتی ہیں وہ ان لوگوں کو میسر نہیں آتی جن کی ہر کامیابی گندے اور گھناؤنے طریقوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ بدیانتین ہو کر بھی قلب کے جس اطمینان اور ضمیر کی جس ٹھنڈک سے بہرہ مند ہوتے ہیں اس کا کوئی ادنیٰ سا حصہ بھی محلوں میں رہنے والے فساق و فجار نہیں پاسکتے۔

۱۷ یعنی آخرت میں ان کا مرتبہ اُن کے بہتر سے بہتر اعمال کے لحاظ سے مقرر ہوگا۔ بالفاظ دیگر جس شخص نے دنیا میں چھوٹی اور بڑی، ہر طرح کی نیکیاں کی ہونگی اُسے وہ اونچا مرتبہ دیا جائیگا جس کا وہ اپنی بڑی سے بڑی نیکی کے لحاظ سے مستحق ہوگا۔

۱۸ اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بس زبان سے اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہہ دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ فی الواقع دل میں یہ خواہش اور عمل لایہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ آدمی قرآن پڑھنے وقت شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے محفوظ رہے، غلط اور بے جا شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہو، قرآن کی ہر بات کو اس کی صحیح روشنی میں دیکھے، اور اپنے خود ساختہ نظریات یا باہر سے حاصل کیے ہوئے تخیلات کی آمیزش سے قرآن کے الفاظ کو وہ معنی نہ پہنچانے لگے جو اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہوں۔ اس کے ساتھ آدمی کے دل میں یہ احساس بھی موجود ہونا چاہیے کہ شیطان سب سے بڑھ کر جس چیز کے درپے ہے وہ یہی ہے کہ ابن آدم قرآن سے ہدایت نہ حاصل کرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان اُسے بہکانے اور اخذ ہدایت سے روکنے اور فکر و فہم کی غلط راہ پر ڈالنے کے لیے دباتی ص ۳۷ پر

۳۷

لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہرہ کرنے سے شکر کرتے ہیں۔
 جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں — اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرے — تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے (تفسیر حاشیہ صفحہ ۳۷) ایسی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اتہائی چونکا رہنا چاہیے اور ہر وقت خدا سے مدد مانگتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان کی دراندازیاں اسے اس سرخسہ ہدایت کے فیض سے محروم نہ کر دیں کیونکہ جس نے یہاں سے ہدایت نہ پائی وہ پھر کہیں ہدایت نہ پاسکے گا، اور جو اس کتاب سے گم راہی اخذ کر بیٹھا اسے پھر دنیا کی کوئی چیز گمراہیوں کے چکر سے نکال سکے گی۔

اس سلسلہ کلام میں یہ آیت جس غرض کے لیے آئی ہے وہ یہ ہے کہ آگے چل کر ان اعتراضات کا جواب دیا جا رہا ہے جو مشرکین نے قرآن مجید پر کیا کرتے تھے، اس لیے پہلے تمہید کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ قرآن کو اس کی اصلی روشنی میں صرف وہی شخص دیکھ سکتا ہے جو شیطان کی گمراہ کن دوسرے اندازوں سے چوکتا ہو اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ سے پناہ مانگے۔ ورنہ شیطان کبھی آدمی کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ سیدھی طرح قرآن کو اور اس کی باتوں کو سمجھ سکے۔

۱۔ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے سے مراد ایک حکم کے بعد دوسرا حکم بھیجنا بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ قرآن مجید کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں اور بارہا ایک ہی معاملہ میں چند سال کے وقفوں سے یکے بعد دیگرے دو دو تین تین حکم بھیجے گئے ہیں، مثلاً شراب کا معاملہ، یا زنا کی سزا کا معاملہ۔ لیکن ہم کو یہ معنی لینے میں اس بنا پر تامل ہے کہ سورہ نخل کی یہ آیت مکی دور میں نازل ہوئی ہے، اور جہان تک ہمیں معلوم ہے اس دور میں بتدریج فی الاحکام کی کوئی مثال پیش نہیں آئی تھی۔ اس لیے ہم یہاں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لیے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصہ بار بار آیا ہے اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملہ کا ر باقی صفحہ ۳۸ پر

اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے کہو کہ اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدیج نازل کیا ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو نچتے کرے اور

دقیقہ ماشیہ ص ۱۳) کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک بات ایک وقت میں محیل طور پر کہی گئی ہے اور دوسرے وقت میں مفصل یہی چیز تھی جسے کفار کہہ اس بات کی دلیل ٹھیرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ یہ قرآن خود تصنیف کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر اس کلام کا منبع علم الہی ہوتا تو پوری بات ایک وقت کہہ دی جاتی، اللہ کوئی انسان کی طرح ناقص العلم تھوڑا ہی ہے کہ سوچ سوچ کر بات کو سے، رفتہ رفتہ معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک بات ٹھیک بٹھیک نظر نہ آئے تو دوسرے طریقے سے بات کرے۔ یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں جو تمہارے اس کلام میں نظر آرہی ہیں۔

۱۷ "روح القدس" کا لفظی ترجمہ ہے "پاک نوح" یا پاکیزگی کی روح" اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریل کو دیا گیا ہے۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے مقصود سامعین کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کلام کو ایک ایسی روح لے کر آرہی ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائف ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کسی بیشی کر کے کچھ اور نیا ہے، نہ کذاب و مفتری ہے کہ خود کوئی بات گھر کے اللہ کے نام سے بیان کر دے، اور نہ بدزیت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس و معطر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لاکر پہنچاتی ہے۔

۱۸ یعنی اس کے بتدیج اس کلام کو لیکر آنے اور بیک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علم و دانش میں کوئی نقص ہے، جیسا کہ تم نے اپنی نادانی سے سمجھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوت فہم اور قوت اخذ میں نقص ہے جس کے سبب وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک وقت کی سمجھی ہوئی بات میں نچتے ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ روح القدس اس کلام کو تھوڑا تھوڑا کیے لانے، کبھی اجمال سے کام لے اور کبھی اسی بات کی (باقی ص ۳۱۱ پر)

فرمانبرداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں ملاح و سعادت کی خوشخبری دے۔
ہیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے۔

رقیبہ عاشیہ ص ۳۲) تفصیل بتائے، کبھی ایک طریقہ سے بات سمجھائے اور کبھی اسے سمجھانے کے لیے دوسرے طریقے استعمال کرے، کبھی ایک پیرایہ بیان اختیار کرے اور کبھی وہی بات دوسرے پیرایہ میں بیان کرے، اور ایک ہی بات کو بار بار طریقہ طریقہ سے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے، تاکہ مختلف قابلیتوں اور استعدادوں کے طالبین حق ایمان لاسکیں اور ایمان لانے کے بعد علم و یقین اور فہم و ادراک میں نچتے ہو سکیں۔

لہذا یہ اس تدبیر کی دوسری مصلحت ہے یعنی یہ کہ جو لوگ ایمان لاکر فرمانبرداری کی راہ چل رہے ہیں ان کو دعوتِ اسلامی کے کام میں اور زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں جس موقع پر جس قسم کی ہدایات درکار ہوتی ہیں وہ بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نہ انہیں قبل از وقت بھیجا مناسب ہو سکتا ہے، اور نہ بیک وقت ساری ہدایات دے دینا مفید ہے۔

۳۔ یہ اس کی تیسری مصلحت ہے یعنی یہ کہ فرماں برداروں کو جن فراہمیتوں اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے، اور جس طرح انہیں تنہا یا اور تنگ کیا جا رہا ہے، اور دعوتِ اسلامی کے کام میں مشکلات کے جو پہاڑ سد راہ ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے وہ بار بار اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی جاتی رہے اور ان کو آخری نتائج کی کامیابی کا یقین دلایا جاتا رہے تاکہ وہ پرامید رہیں اور دل شکستہ نہ ہونے پائیں۔

۴۔ روایات میں مختلف اشخاص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کفار مکہ ان میں سے کسی پر یہ گمان کتے تھے۔ ایک روایت میں اس کا نام جبر بیان کیا گیا ہے جو عامر بن المحضری کا ایک رومی غلام تھا۔ دوسری روایت میں خویطیب بن عبدالغریٰ کے ایک غلام کا نام لیا گیا ہے جسے عائشہ یا عیشہ کہتے تھے۔ ایک اور روایت میں یسار کا نام لیا گیا ہے جس کی کنیت ابو عکبہ تھی اور جو مکہ کی ایک عورت کا یہودی غلام تھا۔ ایک اور روایت بلجان یا بلعام نامی ایک رومی غلام سے متعلق ہے۔ بہر حال ان میں سے جو بھی ہو، کفار مکہ نے محض یہ دیکھ کر کہ ایک شخص توراہ و انجیل پڑھتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی (باقی ص ۳۱۲ پر)

حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں ملتے اللہ کبھی ان کو صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (جھوٹی باتیں ہی نہیں گھڑتا بلکہ جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے، وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔

جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو) تب تو تیر، مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی

(فقیر حاشیہ ص ۳۱) اُس سے ملاقات ہے، بے تکلف یہ الزام گھڑ دیا کہ اس قرآن کو دراصل وہ تصنیف کر رہا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے اپنی طرف سے خدا کا نام لے لے کر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت کے مخالفین آپ کے خلاف افترا پر دازیاں کرنے میں کس قدر بے باک تھے، بلکہ یہ سب بھی ملتا ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کی قدر و قیمت پہچاننے میں کتنے بے انصاف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے تاریخ انسانی کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھی جس کی نظیر نہ اس وقت دنیا بھر میں کہیں موجود تھی اور نہ آج تک پائی گئی ہے مگر ان عقل کے اندھوں کو اُس کے مقابلہ میں ایک عجمی غلام، جو کچھ توراہ و انجیل پڑھ لیتا تھا، قابل تر نظر آ رہا تھا اور وہ گمان کر رہے تھے کہ یہ گوہر نایاب اس کو ملنے سے چمک حاصل کر رہا ہے۔

۱۷۔ دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”جھوٹ تو وہ لوگ گھڑا کرتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے۔“

۱۸۔ اس آیت میں اُن مسلمانوں کے معاملہ سے بحث کی گئی ہے جن پر اُس وقت سخت مظالم توڑے جا رہے تھے اور نا قابل برداشت اذیتیں دے دے کر کفر پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اُن کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم کسی وقت ظلم سے مجبور ہو کر محض جان بچانے کے لیے کلمہ کفر زبان سے ادا کر دو، اور دل تمہارا عقیدہ کفر سے محفوظ ہو، تو معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر دل سے تم نے کفر قبول کر لیا تو دنیا میں چاہے (باقی ص ۳۱۳ پر)

کو پسند کر لیا، اور اللہ کا قاعدہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو راہِ نجات نہیں دکھاتا جو اس کی نعمت کا کفران کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ یہ غفلت میں ڈوب چکے ہیں۔ ضرور ہے کہ آخرت میں یہی خسارے میں رہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں کا (دقیقہ حاشیہ ص ۳۱۲) جان بچا لو، خدا کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ یہ صرف نصیحت ہے، اگر ایمان دل میں رکھتے ہوئے آدمی مجبوراً ایسا کہہ دے تو مبرا خذو نہ ہوگا۔ ورنہ مقامِ غیرِ میت تو یہی ہے کہ خواہ آدمی کا جسم نکال دیا جائے، پھر حال وہ کلمہ حق ہی کا اعلان کرتا ہے۔ دونوں قسم کی نظیریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف خباب بن ارت ہیں جن کو آگ کے انگاروں پر ٹٹایا گیا یہاں تک کہ ان کی چربی پگھلتے سے آگ بجھ گئی مگر وہ سختی کے ساتھ اپنے ایمان پر جمے رہے۔ بلا ل جیسی ہیں جن کو وہی کی زہر پہنا کہ چیلپلاتی دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا، پھر تپتی ہوئی ریت پر ٹٹا کر گھسیٹا گیا مگر وہ اُحد احد ہی کہتے رہتے جیب بن زید بن عاصم ہیں جن کے بدن کا ایک ایک عضوِ مسلمہ کذاب کے حکم سے کاٹا جاتا تھا اور پھر مطابہ کیا جاتا تھا کہ مسلمہ کو نبی مان لیں، مگر مرتبہ وہ اس کے دعوائے رسالت کی شہادت دینے سے انکار کرتے تھے یہاں تک کہ اسی حالت میں کٹ کٹ کر انہوں نے جان دے دی۔ دوسری طرف عمار بن یاسر ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد اور ان کی والدہ کو سخت عذاب دیکر شہید کر دیا گیا، پھر ان کو اتنی ناقابلِ برداشت اذیت دی گئی کہ آخر کار انہوں نے جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کفار اُن سے کہہ کر اپنا چاہتے تھے پھر وہ روتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ما ترکت حتی صبتک و ذکرک المہتمم بخیر یا رسول اللہ مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک کہ میں نے آپ کو برا اور ان کے معبودوں کو اچھا کہہ دیا۔ حضور نے پوچھا کیف تجد قلبک؟ اپنے دل کا کیا حال پاتے ہو؟ عرض کیا مطمئننا بالایمان۔ ایمان پر پوری طرح مطمئن۔ اس پر حضور نے فرمایا ان عادوا فاعد۔ اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو تم پھر یہی باتیں کہہ دینا۔ حاشیہ صفحہ ۳۱۲

یہ فقرے اُن لوگوں کے بارے میں فرمائے گئے ہیں جنہوں نے راہِ حق کو گھٹن پا کر ایمان سے توبہ کر لی تھی اور پھر انہی کا توہمِ مشترک قوم میں جا ملے تھے۔

حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ متلئے گئے تو انہوں نے گھر بار چھوڑ دیے، ہجرت کی، راہِ خدا میں سختیاں بھیلیں اور صبر سے کام لیا، اُن کے لیے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے یعنی ان سب کا فیصلہ اُس دن ہوگا، جبکہ ہر متنفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہونے پائیگا۔ اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے۔ وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفر اخت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا۔ تب اللہ نے اس کے باشندوں کو اُن کے کرتوتوں کا یہ مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں۔ ان کے پاس ان کی اپنی قوم میں سے ایک رسول آیا مگر انہوں نے اس کو جھٹلادیا۔ آخر کار عذاب نے ان کو آیا جبکہ وہ ظالم ہو چکے تھے۔

پس لے لوگو! اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو۔ اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے لہ اشارہ ہے ہاجرین حبشہ کی طرف۔

لہ یہاں جس بستی کی مثال پیش کی گئی ہے اس کی کوئی نشان دہی نہیں کی گئی، نہ مفسرین یہ تعین کر سکے ہیں کہ یہ کونسی بستی ہے۔ بظاہر ابن عباس ہی کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خود کتے کو نامیے بغیر مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت میں خوف اور بھوک کی جس مصیبت کے پھا جانے کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس کے مراد وہ قحط ہوگا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کئی سال تک اہل مکہ پر مسلط رہا لہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کے نزول کے وقت وہ قحط ختم ہو چکا تھا جس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔

لہ یعنی اگر واقعی تم اللہ کی بندگی کے قائل ہو جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، تو حرام و حلال کے خود مختار نہ بنو، جس رزق کو اللہ نے حلال طیب قرار دیا ہے اسے کھاؤ اور شکر کرو، اور جو کچھ اللہ کے قانون میں حرام و ضعیف ہے اس سے پرہیز کرو۔

مردار اور خون اور سٹور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ البتہ ٹھوک سے مجبور ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانون الہی کی خلاف ورزی کا خواہشمند ہو یا حد ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو، تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور یہ جو تہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کر دو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے اقرا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔ دنیا کا عیش چند روزہ ہے۔ آخر کار ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

وہ چیزیں ہم نے خاص طور پر یہودیوں کے لیے حرام کی تھیں جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے

۱۔ یہ حکم سورہ بقرہ (رکوع ۲۱)، سورہ مائدہ (رکوع ۱) اور سورہ انعام (رکوع ۱۱۸) میں بھی گزر چکا ہے۔

۲۔ یہ آیت صاف تصریح کرتی ہے کہ خدا کے سوا تحلیل و تحریم کا حق کسی کو بھی نہیں، یا بالفاظ دیگر قانون ساز صرف اللہ ہے۔ دوسرے شخص بھی جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنے کی جرأت نہ لگا وہ اپنی حد سے تجاوز کرے گا، الایہ کہ وہ قانون الہی کو سندان کرے اس کے فرامین سے استنباط کرتے ہوئے یہ کہے کہ فلاں چیز یا فلاں فعل جائز ہے اور فلاں ناجائز۔

اس خود مختارہ تحلیل و تحریم کو اللہ پر جھوٹ اور اقرا اس لیے فرمایا گیا کہ جو شخص اس طرح کے احکام لگاتا ہے اس کا یہ فعل دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ جسے وہ کتاب الہی کی سند سے بے نیاز ہو کر جائز یا ناجائز کہہ رہا ہے اسے خدا نے جائز یا ناجائز ٹھیرا ہے، یا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ نے تحلیل و تحریم کے اختیارات سے دست بردار ہو کر انسان کو خود اپنی زندگی کی شریعت بنانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ان میں سے جو دعویٰ بھی وہ کرے وہ لامحالہ جھوٹ اور اللہ پر اقرا ہے۔

۳۔ یہ پورا پورا گراف ان اعتراضات کے جواب میں ہے جو مذکورہ بالا حکم پر کیے جا رہے تھے۔ کفار مکہ کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں تو اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں جن کو تم نے حلال کر رکھا ہے۔ اگر وہ شریعت خدا کی طرف سے تھی تو تم خود اس کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ اور اگر وہ بھی خدا کی طرف سے تھی اور یہ تہاری شریعت بھی خدا کی طرف سے ہے تو دونوں میں یہ اختلاف رہتی رہتی

کر چکے ہیں۔ اور یہ ان پر سہارا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ہی ظلم تھا جو وہ اپنے اوپر کر رہے تھے۔ البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب ان کے لیے غفور اور رحیم ہے یا واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھے، اللہ کا مطیع فرمان اور یک سو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا

(تفسیر ماشیہ ص ۳۱۵) کیسا ہے؟ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں سیت کی حرمت کا جو قانون تھا اس کو بھی تم نے آزاد کیا ہے۔ یہ ہمارا اپنا خود مختار فعل ہے یا اللہ ہی نے اپنی ڈیڑھ لگتیوں میں دو متضاد حکم دے رکھے ہیں؟ لہ اشارہ ہے سورہ انعام کی آیت وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ، الایہ در کوع ۱۸، کی طرف جس میں بتایا گیا ہے کہ یہودیوں پر ان کی نافرمانیوں کے باعث خصوصیت کے ساتھ کون کونسی چیزیں حرام کی گئی تھیں۔ اس جگہ ایک اشکال پیش آتا ہے۔ سورہ نحل کی اس آیت میں سورہ انعام کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ انعام اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی لیکن ایک مقام پر سورہ انعام میں ارشاد ہوا ہے کہ دَعَا لَكُمْ لِمَا كَلُمْنَاكُمْ لَمْ يَصْحَبْكُمْ وَأَلَّا تَكُونُوا يَوْمًا كَالَّذِينَ هَدَى اللَّهُ سَبِيلًا أَلَسْتُمْ تَعْلَمُونَ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ ذَكَرْنَا لَكُمْ فِي هَذِهِ سُوْرَةَ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ اس میں سورہ نحل کی طرف صاف اشارہ ہے۔ کیونکہ مکی سورتوں میں سورہ انعام کے سوا ایسی ہی ایک سورہ ہے جس میں حرام چیزوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کونسی سورہ پہلے نازل ہوئی تھی اور کونسی بعد؟ سب سے زیادہ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ پہلے سورہ نحل نازل ہوئی تھی جس کا حوالہ سورہ انعام رکوع ۱۲ کی مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے۔ بعد میں کسی موقع پر کفار مکہ نے سورہ نحل کی ان آیتوں پر وہ اعتراضات وارد کیے جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس وقت سورہ انعام نازل ہو چکی تھی۔ اس لیے ان کو جواب دیا گیا کہ ہم پہلے یعنی سورہ انعام میں بتا چکے ہیں کہ یہودیوں پر چند چیزیں خاص طور پر حرام کی گئی تھیں۔ اور چونکہ یہ اعتراض سورہ نحل پر کیا گیا تھا اس لیے اس کا جواب بھی سورہ نحل ہی میں جملہ متضاد کے طور پر درج کیا گیا۔

یعنی وہ اکیلا انسان بچائے خود ایک امت تھا۔ جب دنیا میں کوئی مسلمان نہ تھا تو ایک طرف وہ اکیلا اسلام کا علمبردار تھا اور دوسری طرف ساری دنیا کفر کی علمبردار تھی۔ اس اکیلے بندہ خدا نے وہ کام کیا جو ایک امت کے کرنے کا تھا۔ وہ ایک شخص نہ تھا بلکہ ایک پورا ادارہ تھا۔

کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ دنیا میں اس کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔ پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ ایک سو ہو کر ابراہیم کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ رہا سبت، تو وہ ہم نے ان لوگوں پر مسلط کیا تھا جنہوں نے اس کے احکام میں اختلاف کیا۔ اور یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان سب باتوں کا فیصلہ

لے۔ یہ مقررین کے پہلے اعتراض کا مکمل جواب ہے۔ اس جواب کے دو اجزا ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی شریعت میں نضا نہیں ہے، جیسا کہ تم نے یہودیوں کے مذہبی قانون اور شریعتِ محمدی کے ظاہری فرق کو دیکھ کر گمان کیا ہے، بلکہ دراصل یہودیوں کو خاص طور پر ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں چند نعمتوں سے محروم کیا گیا تھا جن سے دوسروں کو محروم کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرا جز یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ ملتِ ابراہیمی میں جو چیزیں حرام نہ تھیں جو یہودیوں کے ہاں حرام ہیں۔ مثلاً یہودی اونٹ نہیں کھاتے، مگر ملتِ ابراہیمی میں وہ حلال تھا۔ یہودیوں کے ہاں سُستِ مرغ، بطن، خرگوش وغیرہ حرام ہیں، مگر ملتِ ابراہیمی میں یہ سب چیزیں حلال تھیں۔ اس جواب کے ساتھ ساتھ کفار مکہ کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا گیا کہ نہ تم کو ابراہیم سے کوئی واسطہ ہے نہ یہودیوں کو، کیونکہ تم دونوں ہی شرک کر رہے ہو۔ ملتِ ابراہیمی کا اگر کوئی صحیح پیرو ہے تو وہ یہ نبی اور اس کے ساتھی ہیں جن کے عقائد اور اعمال میں شرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

۱۵۔ یہ کفار مکہ کے دوسرے اعتراض کا جواب ہے۔ اس میں یہ بیان کرنے کی حاجت نہ تھی کہ سبت بھی یہودیوں کے لیے مخصوص تھا اور ملتِ ابراہیمی میں حرمتِ سبت کا کوئی وجود نہ تھا، کیونکہ اس بات کو خود کفار مکہ بھی جانتے تھے۔ اس لیے صرف اتنا ہی اشارہ کرنے پر اکتفا کیا گیا کہ یہودیوں کے ہاں سبت کے قانون میں جو سختیاں تم پلتے ہو یہ ابتدائی حکم میں نہ تھیں بلکہ یہ بعد میں یہودیوں کی شرارتوں اور احکام کی خلاف ورزیوں کی وجہ سے ان پر عائد کر دی گئی تھیں۔ قرآن مجید کے اس اشارے کو آدمی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ ایک طرف بائبل کے ان مقامات کو نہ دیکھے جہاں سبت کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو خروج باب ۲۰۔ آیت ۸-۱۱، باب ۲۳۔ آیت ۱۲-۱۳، باب ۳۱۔ آیت ۱۲-۱۴، و باقی صفحہ پر

کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۷) باب ۳۵ - آیت ۲۰ - ۲۲ - گنتی باب ۱۵ - آیت ۲۲ - ۲۶) اور دوسری طرف اُن جباروں سے واقف نہ ہو جو یہودی سبت کی حرمت کو توڑنے میں ظاہر کرتے رہے مثلاً ملاحظہ ہو پریمیاہ باب ۱۷ - آیت ۲۱ - ۲۴ - حزقی ایل باب ۲۰ - آیت ۱۲ - ۲۴)

یعنی دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔ ایک حکمت۔ دوسرے عمدہ نصیحت۔ حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ انسانی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ بانٹا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔ یہی عمدہ نصیحت تو اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے، برائیوں اور گناہوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں اُن کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی اُجھارا جائے اور ان کے برے تلخ کا خوف دلایا جائے، اور اسی طرح ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ملتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔

یعنی اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی، اور عقلی کشتی اور ذہنی جنگ کی نہ ہو۔ اس میں کج بختیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھپھتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصد و حریف متقابل کو چپ کر دینا (باقی ص ۳۱۹ پر)

اس کی راہ سے ٹھیکاً ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو میں اسی قدر بدلہ لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ اے محمد! صبر سے کام لے جاؤ۔ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔

(تفسیر حاشیہ ص ۳۱۸) اور اپنی زبان آدمی کے ڈونکے بجا دینا نہ ہو۔ بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شرفیاء اخلاق ہو معقول اور دل نکتے و لائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی تھج اور بیٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور حیب عمسوس ہو کہ وہ کچھ بھی پرا ترا یا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گرا ہی میں اور زیادہ دور نہ نکل جائے۔ حاشیہ صفحہ ۳۱۸ یعنی جو خدا سے ڈر کر ہر قسم کے برے طریقوں سے پرہیز کرتے ہیں اور ہمیشہ نیک رویہ پر قائم رہتے ہیں۔ دوسرے ان کے ساتھ خواہ کتنی ہی برائی کریں، وہ ان کا جواب برائی سے نہیں بلکہ بھلائی ہی سے دیتے ہیں۔